پیش لفظ

جمیل مہدی

جب مفکرِ ملّت نمبر کا اعلان کیا تو جہاں اس بات کا شدید احساس تھا کہ برہان کی آدھی صدی پر محیط اشاعتی زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہوگا کہ اس کا خاص نمبر نکالا جائے، وہاں یہ ارادہ بھی تھا کہ مفتی صاحبؒ کی زندگی پر ایک مبسوط مضمون اپنے قلم سے بہ اس خاص اشاعت میں شامل کیا جائے جس میں ان کے کمالات اور خصائص کی اس طور پر نشان دہی ہو کہ کوئی خالی اور اور تشنہ نہ رہ جائے۔ پانچسو صفحات کی ضخامت کا پیشگی اعلان بھی، عام لوگوں اور رفقاء کار کو نامناسب معلوم ہوتا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اتنی ضخامت کا ایسا مواد جو معیار کے لحاظ سے فی الواقع اہمیت رکھتا ہو۔ فراہم کرنا دشوار ہو جائے گا۔ لیکن میرا اندازہ یہ تھا کہ اگر کام واقعتاً باقاعدگی اور سنجیدگی سے شروع ہو تو پانچسو صفحات کی ضخامت نہ صرف کم رہے گی بلکہ اس اعلان شدہ ضخامت میں نمبر کے مواد کو سمیٹنا دشوار

ہو جائے گا۔ تاہم اندازوں پر پورے طور پر بھروسہ کرنا ہمارے نزدیک نہ صرف غلط، بلکہ بعض اوقات خطرناک بھی ہو جاتا ہے اس لیے خاص نمبر کے ذہنی خاکہ میں اس بات کی گنجائش رکھ لی تھی کہ ضرورت ہوئی تو ایک طویل اور مفصل مضمون، سوانحی خاکہ کے طور پر خود اپنے قلم سے مرتب کر کے نمبر میں شامل کر دیا جائے گا۔ لیکن کام جوں جوں آگے بڑھا تو اس مجوزہ مفصل مضمون کی نہ صرف گنجائش کم ہوتی چلی گئی بلکہ مفتی صاحبؒ کے مخلص معاصروں اور قدر دانوں کی تحریروں میں ان تمام گوشوں کے آجانے سے جن کی نشاندہی میرے اس مجوزہ مضمون کے منصوبہ میں شامل تھی، اس مضمون کی ضرورت بھی کم سے کم ہوتی چلی گئی

خصوصاً مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، ڈاکٹر رضی الدین احمد، مولانا حنیف ملّی، قاضی اطہر مبارکپوری، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، مولانا اخلاق حسین قاسمی، اور ڈاکٹر یوسف الدین کے مبسوط مضامین نے اس ضرورت کو تمام و کمال پورا کر دیا، جو الگ سے کسی مبسوط مضمون کی متقاضی ہو سکتی تھی۔ ان حضرات کے اسمار گرامی کے تشخص کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں کہ دوسرے اہلِ قلم کے مضامین اہمیت کے لحاظ سے کسی درجہ میں بھی کم ہیں جو اس نمبر کی زیب و زینت میں کام آئے ہیں، بلکہ مقصد چند مثالوں کے ذریعہ صرف اتنی بات کو واضح کرنا تھا کہ اس صورت میں کہ مضامین کی اتنی کثرت ہو گئی

ہو کہ مجبوراً ایسے مضامین کو جنہیں ابتدائی مرحلے میں، نمبر میں شمولیت کے فیصلہ کے تحت کتابت کرالیا گیا تھا، روک دینا پڑا۔ بلکہ کبھی اہلِ قلم کی تحریروں کے دائرے میں تقریباً وہ تمام گوشے بھی سمٹ کر آگئے، جن کا تذکرہ مفتی صاحبؒ کی شخصیت اور ان کے اختصاصی کمالات کے سلسلے میں ضروری تھا۔ اس لیے اب نہ تو ان کی شخصیت پر مرتّب کے قلم سے کسی الگ اور مستقل مضمون کی حاجت ہے نہ ہی محض ذاتی نمائش کی غرض سے پہلے سے ظاہر شدہ تاثرات کی تکرار اور بار بار کے دہرائے ہوئے تاثرات کو دہراتے چلے جانے کو ہماری طبیعت کبھی گوارا کرتی ہے، اس لیے مختصر طور پر صرف اُن چند باتوں کی نشاندہی تک ہم اپنی تحریر کو محدود رکھیں گے، جو ہماری نظر میں یا تو مشمولہ تاثرات میں جگہ نہیں پاسکی ہیں یا پوری طرح اجاگر ہونے سے رہ گئی ہیں۔

یاد نہیں کہ مفتی صاحبؒ سے شناسائی اور قربت کا آغاز کب ہوا تھا۔ ہم وطن اور ہم قبیلہ ہونے کے ناطے غیریت کا تصوّر تو کبھی ذہن میں بھی نہیں آسکتا تھا لیکن باہمی اعتماد اور ذہنی وابستگی کا سلسلہ آزادی کے بعد شروع ہوا جبکہ قرولباغ کی تباہی کا واقعہ ہوچکا تھا اور مفتی صاحبؒ ندوۃ المصنفین کے قرول باغ والے جلسے سے جامع مسجد کے علاقے میں نئی عمارت کی تعمیر کا منصوبہ تیار کررہے تھے اور ان کے قریب ترین ساتھی بھی ان کے خیال کو

مصرع: ایں خیال است و محال است و جنوں

قرار دے رہے تھے۔

خوب اچھی طرح یاد ہے کہ مفتی صاحبؒ نے ندوۃ المصنفین کی احیاءِ جدید کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی اور مولانا اکبرآبادی دونوں کے عدمِ اتفاق کی بات کہی تو میں نے کسی قدر جھنجھلاہٹ کے ساتھ جواب میں کہا۔

"مولانا حفظ الرحمان اور بھائی سعید کے پاس تو اپنی مشغولیتوں اور مصروفیتوں کے میدان موجود ہیں اس لیے انہیں تو یہ سب کچھ ناقابلِ عمل، ضیاعِ اوقات اور بے معنی دکھائی دیتا ہے لیکن "ندوۃ المصنفین" نہ ہوگا تو آپ کیا کریں گے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ جو لوگ اب تک آپ پر انحصار کرنے پر مجبور ہوتے آئے ہیں، ان ہی لوگوں پر آپ خود انحصار کرنے پر مجبور ہو جائیں "

انہیں شاید اتنی صاف گوئی اور بے لاگ گفتگو کی توقع نہیں تھی سُن کر بالکل چپ اور لب بستہ ہو گئے بہت دیر کے بعد جب ہم اُٹھ کر جانے لگے تو انھوں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

ایک پتہ کی بات کہی ہے تم نے۔ بڑی خوشی ہوئی تمہاری ذہانت پر"

یہاں اتنی بات کہنے کی اور ہے اور وہ یہ کہ "ندوۃ المصنفین" کی احیاءِ جدید کی کوششوں کے سلسلے میں جب مفتی صاحبؒ مولانا ابوالکلام آزاد سے ملے تو انھوں نے اپنی عادت کے بالکل برخلاف واضح الفاظ میں ندوۃ المصنفین کے احیاءِ جدید کے سلسلے میں حکومتی امداد کی پیشکش کی۔ لیکن مفتی صاحب نے اس پیش کش کو منظور نہیں کیا۔ اس ملاقات کی یاد کبھی آتی تو وہ بڑے فخر اور

مسرت کے ساتھ کہتے کہ جب میں نے مولانا سے کہا۔

"حکومت کی امداد میں چند نزاکتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا پتہ امداد کے قبول کرنے کے بعد ہی چلتا ہے تو مولانا چپ ہو گئے۔"

جی ہاں! - یہ انکا مخصوص جملہ تھا، جسے کبھی وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے تمہید کے طور پر استعمال کرتے۔ کبھی مخاطب کی لمبی تقریر کے بعد، اس سلسلہ کو ختم کرنے کے لیے کام میں لاتے، کبھی اختلافی بحثوں میں مفاہمتی فضا پیدا کرنے کے لیے بحث کو کاٹنے اور پیچ بچاؤ کے لیے یہ جملہ کام میں آتا۔ کبھی سیدھی سادی تائید اور کبھی عدمِ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے وہ اس جملہ سے کام لیتے۔ مختلف محلِ استعمال کے لحاظ سے اس کا سائز بھی کم زیادہ ہوتا رہتا اور اسلوبِ بیان میں بھی صاف اور صریح فرق وہ اسی کے ذریعہ پیدا کرنے میں حیرت انگیز طریقہ سے کامیابی حاصل کر لیتے۔
ایک بار ایک ایسے امیدوار کی ناکامی کے سلسلے میں وہ ان صاحب سے گفتگو کر رہے تھے جنہوں نے انٹرویو میں ان کو ناکام قرار دیا تھا، تو یکایک انھوں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔
جی ہاں، انٹرویو میں ناکامی بھی ایک بہت بڑی وجہ ہوتی ہے لیکن اس کو بھی دیکھ لینا چاہیئے کہ کامیابی اور ناکامی بجائے خود کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اب آپ اتنے بڑے قابل اور اتنے بڑے عالم ہیں لیکن انٹرویو میں، میں خود آپ کو فیل کر سکتا ہوں۔ اسی

کے ساتھ یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ آپ بھی مجھے فیل کر سکتے ہیں"۔ وہ صاحب سٹپٹائے تو بہت، جھنجھلائے بھی بہت، لیکن لاجواب اور چپ ہو جانے کے سوا، ان سے کچھ اور نہ بن نہیں پڑا۔

اسی طرح ایک بڑے ملی اجتماع میں، جب ہمارے دو اکابرین کے درمیان لفظی مجادلے کی شدت اس درجہ پر پہنچ گئی کہ اس کے نتیجہ میں ایک بحرانی کیفیت کے ابھر آنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تو مفتی صاحب نے حسبِ معمول۔ ایک لمبی "جی ہاں" کے ذریعہ اس بحث میں مداخلت کرتے ہوئے پہلے تو ایک فریق کے موقف کی بہت دور تک تائید کی اور اس کے فوراً بعد — "اور یہ بات بھی غلط ہے" کہہ کر دوسرے فریق کی تائید کا سلسلہ شروع کیا تو چند ہی منٹ پر وہ صورتِ حال جو شدتِ اختلاف سے بوجھل اور گلوگرفتہ محسوس ہو رہی تھی، مفاہمت اور خوشگواری کے خوشبو سے معطر نظر آنے لگی۔

مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کے شخصی خصائص اور کمالات کا شمار یوں تو بہت مشکل کام ہے، مگر ہمارے نزدیک ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ خود شناسی میں اختصاص رکھتے تھے اس سلسلہ میں وہ بلا مبالغہ عرفانِ ذات کے مقام تک پہنچ چکے تھے، اور یہی وجہ تھی کہ اپنی خوبیوں اور کمزوریوں کا احساس خود ان سے زیادہ کسی کو نہ تھا۔ جہاں تک ان کی انتظامی صلاحیتوں کا سوال ہے، خود "ندوۃ المصنفین" کا وجود اس کے ثبوت کے لیے

کافی ہے، جسے انھوں نے ایک بار تعمیر کیا اور دوسری بار اس کی راکھ سے دوبارہ پیدا کر دینے کا وہ کارنامہ کر دکھایا جسے سب لوگ ناممکن اور خارج از امکان سمجھتے تھے، لیکن اجتماعی میدان میں انھوں نے اس ذمہ داری کے بوجھ کو تنہا اٹھانا کبھی پسند نہیں کیا اور ہمیشہ اس سے بڑے سلیقہ کے ساتھ دامن سمیٹ کر گزرتے رہے۔

میرٹھ اجلاس کے بعد۔ ان کے لیے پورا موقع تھا کہ وہ جمعیۃ العلماء کی تقسیم کر کے، اس تنظیم کے بڑے اور فعال حصے پر قابض ہو جاتے لیکن انھوں نے عین اس وقت جب کہ بھوپال اجتماع کے وقت اس کے لیے بظاہر بڑا ساز گار موقع نکل آیا تھا، خود اپنی ذات کو اس تقسیم کا سبب بنانے سے انکار کر دیا اور اپنے اس موقف میں ادنیٰ سی لچک پیدا کرنے پر تیار نہ ہوئے کہ تقسیم کی ذمہ داری کوئی اور اٹھائے اور اس کے مشیر کار اور ایڈوائزر تک اپنے کردار کو محدود رکھیں لیکن مصیبت یہ تھی کہ ان کے حامیوں اور ساتھیوں میں کوئی ایسی باہمت اور بڑی شخصیت موجود نہ تھی جو پہل اقدامیت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتی، اس لیے وہ موقع ہاتھ سے نکل گیا لیکن مفتی صاحبؒ کو اس موقع کے ہاتھ سے نکلنے کا پچھتاوا کبھی نہیں ہوا۔ جب بھی کوئی موقع آیا تو انھوں نے ہمیشہ اپنے اس موقف کو جائز اور اطمینان بخش قرار دیا جو انھوں نے بھوپال میں اختیار کیا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں کانگریس (۱) کی دوسری بار کی تقسیم کے موقع پر، ان سے بات

ہوئی تو انھوں نے بڑے فخر کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں بھوپال اجلاس کے حوالے سے کہا۔

جی ہاں! ۔اُس وقت میں تیار ہو جاتا تو تقسیم در تقسیم کے اس مرحلے سے مجھے گذرنا پڑتا، جو اس وقت اندرا گاندھی کو درپیش ہے غلط بات ایک بار شروع ہو جائے تو پھر کسی جگہ رکتی نہیں نئی نئی غلطیوں کو پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ اب دیکھو انڈین نیشنل کانگریس اندرا کانگریس تک محدود ہو کر رہ گئی۔ رہا اکثریت اور حکومت پر قبضہ کا معاملہ تو یہ چلتا ہی رہتا ہے، اصل اور اصول سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔

ان کی صلح کن فطرت اور مرنجان مرنج طبیعت کو دیکھ کر بعض لوگ انہیں کمزور اور بے ہمت سمجھتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان جیسا باہمت اور جری اور بہادر آدمی ان کے معاصروں میں کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔ جن لوگوں نے ۱۹۶۶ء کے مجلس کے مجلسِ مشاورت دیوبند کے ہنگامے کے دوران، انہیں قاتلانہ عزائم کے حامل ہجوم اور برستی ہوئی لاٹھیوں کے درمیان پُرسکون اور بے خوفی کی حالت میں، پامردی کے ساتھ کھڑا دیکھا ہے جن میں سے ایک ہم خود بھی ہیں۔ وہ لوگ انھیں کمزور اور بے ہمت کہنے اور سمجھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ اس طرح کی بات اور ان کے کردار کا یہ پہلو اتفاقاً ابھر کر سامنے آگیا ہو بلکہ جہاں کہیں، بے خوفی، اور جرأت کے ساتھ کوئی بات کہنے اور فیصلہ کن موقع پر فطرت کا مقابلہ کرنے کی ضرورت

پیش آئی۔ انہوں نے ادنیٰ سے ادنیٰ اور پس وپیش کے ساتھ انکے کردار کا یہ پہلو نمایاں ہوکر سامنے آیا جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے مسلم کنونشن کے موقع پر جس وقت اس زمانہ کے نائب وزیرِ اعظم اور بظاہر سب سے زیادہ مضبوط سیاسی شخصیت مرارجی ڈیسائی نے اس کنونشن میں شریک ہوکر مسلمانوں کو اپنی تقریر میں ڈرانا دھمکانا شروع کیا اور اس سلسلے میں بار بار یہ کہنا شروع کیا کہ مسلمانوں کا فلاں رویہ برداشت نہیں کرسکتے اور ان کا فلاں طریقہ انہیں پسند نہیں، اور مسلمان فلاں معاملہ میں ملک کے مفاد کو ملحوظ نہیں رکھتے تو وہ کچھ دیر تو تحمل اور ضبط کے ساتھ ان کی تقریر کو سنتے رہے لیکن جب پانی بالکل ہی سر سے گزرنے لگا تو انھوں نے کھڑے ہوکر مرارجی ڈیسائی کو ٹوکتے ہوئے یہاں تک کہدیا کہ :

"آپ تو گویا اس ملک کے بادشاہ ہیں، جو اپنی پسند اور مرضی پر مسلمانوں کو چلنے کا فرمان سنانے یہاں آئے ہیں، آپ کو یہ بات پسند نہیں، وہ بات پسند نہیں، یہ بات آپ گوارا نہیں کرسکتے، وہ بات آپ برداشت نہیں کرسکتے، آپ ہیں کیا جو مسلمان آپ کی مرضی، اور آپ کی پسند اور آپ کے فرمان کی تعمیل پر اپنے آپ کو مجبور سمجھیں؟"

ان کی اس موقع پر جرأت کے مظاہرے سے نہ صرف مرارجی بھائی دم بخود رہ گئے بلکہ مسلمانوں پر خوف اور اضطراب کی جو کیفیات ان کی تقریر سے طاری ہوگئی تھیں وہ چند ہی منٹوں میں غائب ہوگئیں، اس کے بجائے خود اعتمادی کی فضا پورے اجتماع پر لوٹ آئی۔

اس طرح کے بیسیوں واقعات ہمارے علم میں ہیں جن کا ایک مفصل اور مبسوط مضمون ہی متحمل ہوسکتا ہے۔ یہاں صرف اتنی بات کہہ کر ہم اس موضوع کو ختم کرتے ہیں کہ مفتی صاحبؒ کے شخصی اور ذاتی کمالات کا بہت تھوڑا حصہ لوگوں کے سامنے آسکا ہے جبکہ ایک بہت بڑا حصہ اس دور کے تقاضوں اور اسکی لائی ہوئی مشغولیتوں کی بنا پر لوگوں کی نظر سے اوجھل ہوگیا جس آزادی کے بعد ان کی وفات تک کے وقت تک انہیں مختلف میدانوں میں رواں دواں رکھا حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کی بہت کم مہلت اس دور میں حاصل کرسکے، جو سیاسی ابتلا و رست وخیز کے لحاظ سے ایک تاریخی دور تھا۔ سیاسی ہنگاموں اور اُن کے لائے ہوئے بے شمار مسائل نے انہیں کسی دوسری طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی آزادی کے بعد نہ دیا، پھر بھی ذاتی حیثیت میں وہ جتنا کام کرگئے وہ اُن کے نام کو ملّی تاریخ میں ہمیشہ محفوظ رکھنے کے لیے یقیناً کافی ہے اور خدا نے چاہا تو وہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ کے اونچے مقام پر نہ صرف بدستور رہیں گے بلکہ دن گزرنے کے ساتھ ان کی شخصی افادیت اور اجتماعی خدمت کی اہمیت میں بھی اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔

ترتیب کے اعتبار سے مفکرِ ملّت نمبر کو چار حصّوں میں تقسیم کیا جارہا ہے۔ پہلا حصہ ان مضامین پر مشتمل ہے جو اُن کے قابلِ احترام معاصرین قدردانوں اور رتبہ شناسوں کے قلم سے ہیں اور جن کے ذریعہ ان کی شخصیت اور ان کے خصائص اور اُن کے

کمالات پر بھرپور یا مجمل انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرا حصہ خود ان کی ایسی تحریروں پر مشتمل ہے جن سے ان کی زندگی، ان کی فکری نشوونما، اور ان کے اسلوبِ نگارش کے بارے میں بھرپور معلومات پڑھنے والوں کے سامنے آئیں گی۔ دوسرا اور چوتھا حصہ زیادہ تر مولانا انیس الحسن ہاشمی کا مرتب کردہ ہے، اسی لیے اُس کی ترتیب کا انداز بھی پہلے حصہ سے مختلف ہوگیا ہے۔ مولانا انیس الحسن ہاشمی مفتی صاحبؒ کے قریبی اور معتمد ساتھیوں میں رہے ہیں اس لیے اس حصے کو اپنی طرف سے کوئی ترمیم تنسیخ کے بغیر اسی طرح شائع کر رہے ہیں جس طرح انھوں نے کتابت کرادیا تھا۔ اس حصے میں مفتی صاحبؒ کی خودنوشت سوانح پر مشتمل وہ مضمون جو ہفتہ وار 'عزائم' کے ۱۹۶۲ء کے خاص نمبر میں شائع ہوا تھا اور مولانا غلام محمد نورگت کے نام ان کے چند ذاتی خطوط کا اضافہ ہماری طرف سے کیا گیا ہے تاکہ ان کی ذاتی زندگی اور دنیا جہان کی فکر رکھنے کے اس پہلو کی جھلک بھی سامنے آسکے جو ان خطوط کے بغیر یقیناً اوجھل رہ جاتا۔

تیسرے حصے میں جو نیم ذاتی اور نیم اجتماعی نوعیت رکھتا ہے، کچھ ایسی تحریروں پر مشتمل ہے جن میں شیخ محمد عبداللہ، ڈاکٹر سید محمود اور مولانا محمد مسلم مرحوم کی تحریریں بھی شامل ہیں جن سے ایسے معاملات پر روشنی پڑتی ہے جو ہمارے نزدیک قابلِ تذکرہ اور ضروری تھے، چوتھا حصہ ان تحریروں پر مشتمل ہے جو اُن پیغامات اور تعزیتی تحریروں سے تعلق رکھتی ہیں جو مفتی صاحب کی وفات کے بعد ذاتی اور سیاسی وصحافتی تاثرات کی شکل میں سامنے آئیں۔ یوں وہ تصویر

مکمّل ہوجاتی ہے، جو اس خاص نمبر کے ذریعے ہم بنانا چاہتے تھے
ہمیں احساس ہے، اس تصویر میں وہ رعنائی وہ دلکشی اور وہ آب و
تاب پیدا نہیں ہوسکی ہے جو صاحبِ تصویر کے زندہ پیکر میں موجود
تھی، تاہم اس کا اطمینان ہے کہ تصویر کی حد تک ان خصوصیات کی
تھوڑی بہت جھلک ضرور آئے گی۔

آخر میں ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ مولانا انیس الحسن ہاشمی اور
مولانا فقیہ الدین اور عزیزی عمید الرحمان عثمانی کی ان محنتوں اور
تعاون کا شکریہ ادا کریں جو برہان کے خاص نمبر کے مواد کے جمع کرنے
اور اس کی ترتیب و تشکیل کے سلسلے میں حاصل ہوا، اور جس کے
بغیر اس تکمیل و اشاعت ممکن نہیں تھی۔ ...

نوٹ

ذیل کے تینوں مضامین ہمیں اس وقت ملے جب کہ مفتی اعظم نمبر
کے نگیٹو بن چکے تھے، لیکن چونکہ یہ مضامین اہم تھے جن کا اس نمبر
میں آنا ضروری تھا لہٰذا ترتیب مضامین کے برعکس جہاں گنجائش
ملی وہیں ان کو شامل کرلیا۔

(۱) ڈاکٹر معین الدین بقائی

(۲) احمد سعید ملیح آبادی

(۳) حکیم محمد عرفان الحسینی

عرضِ حال

جن لوگوں کو طباعتی اور اشاعتی کام کا تجربہ ہے وہ اس راہ کی دشواریوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اس بات کو بھی جانتے ہیں کہ فی زمانہ کسی خاص نمبر کا مرتّب کرنا اور اسے کتابت و طباعت کی جاں کاہ منزلوں سے گزارنا کتنا مشکل کام ہے۔ برہان کے "مفکرِ ملت نمبر" کا اعلان اگرچہ بنامِ خدا، حضرت مفتی صاحبؒ کی رحلت کے فوراً بعد ہی کر دیا گیا تھا اور برہان کے ایڈیٹر محترم جمیل مہدی صاحب نے اس کی ذمہ داری بھی پوری طرح لیکر، مجھے اس کی فکر و تشویش سے نجات دلادی تھی لیکن ذمہ داری کے احساس نے پوری طرح بے فکر ہونے سے باز رکھا کیونکہ مضامین کی فراہمی و ترتیب و تزئین کے علاوہ کتابت و طباعت کے مرحلوں کا انتظام تو بہرحال مجھی کو کرنا تھا۔

اس سلسلے میں ایک بڑا کام مفتی صاحبؒ سے متعلق تحریروں اور مسودوں کو چھانٹنے کا کام بھی بڑا اہم تھا جو ان پشتاروں کے نیچے دبے پڑے تھے، جو دفترِ برہان میں نہ معلوم کب سے جمع ہو رہے تھے، اس سلسلے میں مولانا فقیہ الدین کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے، جنہوں نے میری درخواست کو قبول کرکے کاغذات کے انبار میں سے کارآمد کاغذوں کو چھانٹنے کا کام شروع کیا، اور کئی مہینے کی محنت شاقہ کے بعد اس کام کو مکمل کر دیا۔

دوسرے نمبر پر مولانا انیس الحسن ہاشمی کا شکریہ واجب ہے جنہوں نے ابتدائی تیاریوں میں ہاتھ بٹایا اور خط و کتابت سے لے کر مضامین کے انتخاب اور ترتیب میں تعاون کیا۔

اس دوران میں نے مضامین کی فراہمی کے لیے خود بھی کوشش کی اور اس سلسلہ میں مختلف اکابرین کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے مضامین لکھنے کی ذاتی طور پر بھی درخواست کی، اس سلسلہ میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا خاص طور پر شکریہ واجب ہے جنہوں نے نہ صرف مضمون لکھنے کی زحمت اٹھائی بلکہ ایسے حوصلہ افزا کلمات اپنی زبانِ مبارک سے ارشاد فرمائے کہ اس سے ہمت بلند ہوئی اور کام آسان معلوم ہونے لگا۔

حضرت مولانا علی میاں نے از راہ خورد نوازی مجھ سے یہ وعدہ بھی فرمایا کہ وہ مفکرِ ملت نمبر کی اشاعت کے بعد اس کے اجراء کی تقریب کی مسندِ صدارت کو بھی رونق بخشیں گے امید ہے کہ نمبر کی اشاعت کے بعد ہمیں مولانا موصوف کی سرپرستی کے جذبہ سے ایک بار پھر مفتخر ہونے کا موقع ملے گا۔

زیرِ نظر نمبر کی اشاعت کے سلسلے میں ہمارے کرم فرما اور مفتی صاحبؒ کے مخلص اور قدردان سید اقتدار حسین (بمبئی) اردو اکادمی دہلی کے صدر محترم ڈاکٹر خلیق انجم اور عالی جناب حکیم عبد الحمید صاحب کا شکریہ بھی ضروری ہے جن کی مساعی نے برہان کے مفکرِ ملت نمبر کی اشاعت میں مالی استعانت کے ذریعہ ہمارا کام بہت آسان کر دیا۔

آخر میں، میں برہان کے تمام مضامین نگار حضرات سرپرستوں قارئین اور خاص کر مولانا حکیم محمد زماں حسینی صاحب کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی مسلسل توجہات اور قدر افزائی سے یہ مشکل منزل آسان ہوئی اور تقریباً ایک سال کی سخت محنت اور ذہنی پریشانی سے بالآخر نجات مل گئی۔ خدا کرے یہ نمبر قبولِ عام کی سند حاصل کرے۔ آمین

عمید الرحمٰن عثمانی ۔ منیجر و مہتمم ندوۃ المصنفین، رسالہ برہان جامع مسجد دہلی

فہرست مضامین

پہلا حصّہ

		صفحہ
۱: چند یادیں چند باتیں	مولانا ابوالحسن علی ندوی	۲
۲: مفتی صاحب ایک منکسر المزاج مریض	ڈاکٹر معین الدین بقائی	۱۷
۳: حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ	مولانا حکیم محمد عرفان الحسینی	۲۲
۴: مفتی صاحب کی یادیں	الحاج احمد سعید ملیح آبادی	۳۱
۵: مفتی صاحب کی یادیں	ڈاکٹر یوسف نجم الدین	۳۷
۶: مفتی صاحب کی زندگی کے چند گوشے	قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی	۴۱
۷: حضرت کی یاد آئی	رضی الدین احمد	۵۰
۸: مفتی صاحب سے میرے علمی تعلقات	قاضی اطہر مبارکپوری	۷۶
۹: مفتی عتیق الرحمن عثمانی اسلاف کی روایات	مولانا حنیف ملّی	۹۵
۱۰: مفتی عتیق الرحمن عثمانی	محمد ظفر الدین مفتاحی	۱۰۹
۱۱: خدمت افتاء	مولانا انیس الحسن ہاشمی	۱۳۵
۱۲: مفتی عتیق الرحمن عثمانی	حکیم سید حسین دہلوی	۱۴۶
۱۳: وہ بہار جو پھر کبھی لوٹ نہ سکی	قاری محمد ادریس	۱۵۲
۱۴: مفتی صاحب مرحوم	پروفیسر طاہر محمود	۱۵۶
۱۵: صاحب ذکر و فکر	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	۱۵۹
۱۶: فخر قرن	حکیم عبدالقوی دریابادی	۱۶۲
۱۷: مفتی صاحب کی یادیں	مولانا اخلاق حسین قاسمی	۱۶۸
۱۸: گوہر شب چراغ	مولانا انظر شاہ مسعودی	۱۸۹
۱۹: ان کی یاد	کرنل بشیر حسین زیدی	۱۹۹
۲۰: مفتی عتیق الرحمن عثمانی نقوش و تاثرات	ڈاکٹر سید احتشام احمد	۲۰۱
۲۱: ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی	مولانا سالم قاسمی	۲۰۵
۲۲: سراپا شفقت مفکر ملت	حاجی محمد رفیع	۲۱۶